© rasailojaraid.com

پروفیسر خالد شبیر احمد
قسط:۳۹

ورق ورق زندگی

ایس ای کالج بہاول پور میں میرا قیام صرف چار سال تک محدود رہا۔ یہ چار سال میری زندگی کا انتہائی خوب صورت حصہ ہے۔ بہاول پور میں محبت اور خلوص کی وہ صحبتیں میسر آئیں جنھوں نے دل و دماغ کو منور و معطر کر دیا۔ وہاں کی رفاقتیں خوشبو کی طرح میری روح میں مہکتی ہیں اور وہ دوست جو وہاں رفیقِ کار تھے دل کی گہرائیوں میں ایسے اترے کہ آج بھی یوں محسوس ہوتا ہے کہ میرے آس پاس ہیں۔ اُن دنوں کا تذکرہ میرے کان میں گنگناتا ہے ؎

شوق تیرا لے اُڑا پُر کیف یادوں کی طرف
ہر ایک منظر پیار کا پھر یاد آ کے رہ گیا

کس کس کو یاد کیا جائے اور اُن کے بارے میں کیا کیا لکھا جائے۔ اسلم انصاری، عابد صدیق، عطاء اللہ اعوان، طیب قریشی، اسداریب، بشیر عاربی، فروغ جلیل، سہیل اختر، پرنسپل دلشاد کلانچوی، پرنسپل منور علی خان، ڈاکٹر صدیق۔

ڈاکٹر صدیق:

ڈاکٹر صدیق زبان کے سچے اور دل کے ستھرے انسان تھے۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ مگر مجال ہے کہ کبھی اپنی قابلیت پہ اتراتے نظر آئیں۔ بات کم مگر عمدہ کرنے والے مرنجاں مرنج اور صلح کن۔ ان کی باتیں دل میں یوں اترتیں جیسے گلاب کے پھولوں پر شبنم کے قطرے۔

طیب قریشی:

طیب قریشی کی نرالی باتوں کو سنتے رہنے کے لیے دل مچلتا تھا۔ ذہین بھی تھے اور با مطالعہ بھی۔ خوش گفتار، خوش خصال، خوش لباس۔ ان کی گفتگو ہی نہیں ان کے قہقہے بھی دل افروز اور مسرّت افزا ہوتے تھے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات پر پختہ یقین اور دین سے لگاؤ ان کی فطرت تھی۔ جو ان سے دور ہوتا انھیں کسی قدر مغرور اور جو نزدیک ہوتا وہ ان کے عجز و انکسار کا معترف ہو جاتا۔ اُن کی ذات کالج کی شان تھی اور دوستوں کی آن۔ انگریزی لباس میں دینی حمیت سے مالا مال طیب صاحب کی ذات بہت سی خوبیوں کا مجموعہ تھی۔ اُن کا کمرہ ہماری محفلوں کا خاص مرکز ہوا کرتا تھا۔ کالج سے میرے تبدیل ہونے کے بعد رشید الزمان نے (جس کی اشراکیت نوازی کا ذکر پہلے ہو چکا ہے) دین کی خلاف کوئی قابلِ اعتراض بات سٹاف میٹنگ کے دوران کہہ دی۔ طیب قریشی سخت برہم ہوئے اور اپنا بھاری بھرکم جوتا اُتار کے اس کے سر پر مارنا چاہا۔ موجود ساتھیوں نے بیچ بچاؤ کرایا۔ طیب صاحب کہنے لگے ''تو سمجھتا ہے کہ خالد شبیر یہاں سے تبدیل ہو گیا ہے تو تجھے یہاں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کھُل کھیلنے کے لیے آزاد چھوڑ دیا جائے گا۔ خالد شبیر یہاں سے جانے سے پہلے کئی خالد شبیر پیدا کر کے گیا ہے''

ڈاکٹر اسلم انصاری:

ڈاکٹر اسلم انصاری سے شناسائی کا آغاز تو ملتان میں ہوگیا تھا۔ بہاول پور میں یہ دوستی پروان چڑھی۔ ایک دوسرے کے قریب ہوئے تو اُن کے جوہر مجھ پہ مزید کھلے۔ اُن کے الفاظ آج بھی کانوں میں رس گھولتے ہیں۔ اُن کی انگریزی اردو، فارسی ادب پر دسترس، اُن کی شاعری اور غیر معمولی علمی و ادبی صلاحیتوں نے مجھے اپنا گرویدہ بنالیا۔ مفکر احرار چودھری افضل حقؒ کی شاہکار کتاب ''زندگی'' پر اُنھوں نے جو فاضلانہ تحقیق کی ہے اس سے علوم انسانی پر اُن کی وسیع دسترس کا اندازہ ہوتا ہے۔ ایک مدت تک میں اُنھیں یوپی، سی پی کا مہاجر سمجھتا رہا بعد میں پتہ چلا کہ وہ ٹھیٹھ ملتانی ہیں۔ مجھے یقین نہیں آیا تو انھوں نے میرے پُر زور اصرار پر ملتانی زبان میں بات چیت کر کے مجھے قائل کیا کہ وہ واقعی ملتانی ہیں۔ اس سے اُن کی اردو زبان پر گرفت، اُن کے لہجے کی مہارت اور اُن کے عمدہ اور منفرد اندازِ گفتگو کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اُن جیسی خوبصورت اردو بولنے والے اب خال خال نظر آتے ہیں۔ اُن کے بارے میں کہا جاسکتا ہے:

تیرا سخن ہے کہ جھرنا کوئی خیالوں کا
تیرا خیال کہ قدرت کا اک کرشمہ ہے

عطاء اللہ اعوان:

اعوان میرا عزیز از جان دوست ہے۔ اسلام قبول کرنے کے بعد اُس نے جس استقامت اور استقلال کا مظاہرہ کیا جی چاہتا ہے اُس پر محبتوں کی بارشیں برسائی جائیں۔ اُس کی دوستداری و وفا شعاری، اُس کا احترامِ آدمیت، تعلقات میں اُس کا وہ بڑا پن....غرضیکہ عطاء اللہ اعوان زندگی کے سفر میں ایک گلستانِ مہر و وفا ثابت ہوا ہے۔ حضرت امیر شریعت رحمہ اللہ تعالیٰ سے ہمارا مشترکہ عشق ہماری دوستی کو رسوخ و پائیداری کے ان گنت نئے زاویے فراہم کرتا ہے۔

پروفیسر فروغ جلیل:

پروفیسر فروغ جلیل بھی یاد آتے ہیں۔ اگلی شرافت کا نمونہ، دینی خاندان کا چشم و چراغ۔ وہ اگرچہ اپنے ہی من میں ڈوب کر اپنی ہی دنیا میں گزر بسر کرنے والے انسان تھے پھر بھی پیارے لگے۔ دوستوں سے گریزاں رہے مگر اُن کی ہمسائیگی کی خوش گوار یادیں آج بھی میرے دل میں اُن کی یاد کی شمع روشن کیے ہوئے ہیں۔

محمد حسن چغتائی مرحوم:

کالج کے رفقاء کے علاوہ شہر کے جن افراد نے مجھے متأثر کیا ان میں جناب محمد حسن چغتائی مرحوم و مغفور سرِ فہرست ہیں۔ اللہ انہیں غریقِ رحمت کرے۔ جماعتِ احرار سے اُن کا تعلّق نظریات و عمل سے کہیں بڑھ کر عقائد کی سطح تک پہنچا ہوا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تھا۔امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ سے والہانہ محبت کرتے تھے۔ان کے اور میرے درمیان امیر شریعت کی ذاتِ گرامی ہی موضوعِ گفتگو رہتی۔انتہائی متین، سنجیدہ اور پارسا و معاملہ فہم، ساری زندگی عرضی نویسی کی پاکیزہ مزدوری کے ذریعے حلال کمایا اور کھایا۔نہایت اُجلا سوادِ خط، اور اُس سے زیادہ اُجلی اُن کی شخصیت، ظاہر میں بھی اور باطن میں بھی۔ میں نے اپنے مختصر عرصۂ حیات میں نظریات سے ایسی بھرپور وابستگی کم کم ہی دیکھی ہے۔ بہاول پور کی جماعتِ احرار اسلام اُنھی کی ذات و صفات کی روشنی سے مستنیر تھی۔ بعد میں وہ مجلس احرار اسلام پاکستان کے صدر بھی منتخب ہوئے۔کل ہند مجلسِ احرارِ اسلام سے وابستہ حریت کیش رندانِ صفا مست کے قافلے کے احوال و مقام کی تاریخ کے عینی شاہد بھی تھے اور حافظ بھی۔ان سے بہت سی ایسی معلومات حاصل ہوئیں جو میں نے کہیں نہیں پڑھیں۔ان کی میرے ساتھ محبت میرا سرمایہ حیات ہے۔

پروفیسر سہیل اختر مرحوم:

بہت اچھے شاعر تھے۔خود بھی خوبصورت اور شاعری بھی خوبصورت۔ان کا ہر شعر دل پہ نقش ہو کر ادبی حس کو جلا بخشتا اور دل کیفیات کی گہرائیوں میں ڈوب جاتا تھا۔اُن کی ذات اور اُن کی شاعری سے وابستہ حسین یادوں کو بھلانا میرے لیے مشکل ہے۔سوچتا ہوں کہ زندگی کی راہ پر لوگ بچھڑ جانے کے بعد بھی یادوں میں اس طرح برابر موجود رہتے ہیں جیسے دل میں دھڑکنوں کا سلسلہ موجود رہتا ہے۔ وہ کیسے عمدہ شاعر تھے اس کا کسی قدر اندازہ ان کے درج ذیل اشعار سے لگایا جاسکتا ہے۔ ؎

خواہشیں شہرِ نگاراں میں سسکتی ہی رہیں — جبر کے بوجھ سے دم توڑتے سپنوں کی طرح
حسرتیں شہرِ نگاراں میں لیے کاسۂ دل — ایک اک چہرے کو تکتی ہیں گداؤں کی طرح

☆

ہم نے ظلمتوں کو دیا تھا پیامِ صبح — پھرتے ہیں آج ہم ہی مگر تپتی دھوپ میں
پروردگار پھر کوئی تاریک سی گھٹا — کجلا گیا حُسنِ بشر تپتی دھوپ میں

اُن کی ایک غزل اُن کی اپنی آواز میں سُننا بھی مجھے اچھی طرح یاد ہے۔

گُل جلے، گلشن جلے، صحرا جلے، دریا جلے — وقت کی آتش میں سب کچھ جل گیا اور کیا جلے
یُوں ستم کے آتشیں لمحات میں جلتا ہے دل — کفر کے شعلوں میں جیسے مسجدِ اقصیٰ جلے
ڈس گئے اہلِ جنوں کو غم کی زنجیروں کے سانپ — اس طلسمی آگ میں کیا کیا یدِ بیضا جلے
شدتِ احساس سے یُوں جل رہے ہیں جسم و جاں — جس طرح برقِ تپاں سے وادیٔ سینا جلے
راستے تاریک، منزل گم، قدم بھٹکے ہوئے — اس سفر میں اے خدا! کوئی تو نقشِ پا جلے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جامی صاحب سے آخری ملاقات:

جامی صاحب بھی بہت یاد آتے ہیں۔ عرصہ ہو گیا کوئی رابطہ نہیں۔ پتہ نہیں زندہ ہیں کہ نہیں مگر میرے دل میں تو وہ زندہ ہیں اور زندہ رہیں گے۔ بہاول پور کے دینی اور علمی خاندان کے چشم و چراغ۔ ان کے ساتھ نہ جانے کتنی ملاقاتیں رہیں۔ ان کے علوم و معارف سے میں خوب مستفیض ہوا۔ بہاول پور سے تبدیل ہونے کے بعد ایک بار میں جب بہاول پور دوستوں کو ملنے کے لیے گیا، تو برادرِ گرامی پروفیسر عطاء اللہ اعوان کو ساتھ لیے ان کو ملنے کے لیے بھی جانا ہوا۔ گھر سے باہر آئے، ملاقات ہوئی، مگر پریشان سے نظر آئے۔ کہنے لگے کہ نمازِ مغرب کا وقت ہے چلیں پہلے نمازِ مغرب ادا کر لیں۔ ہم تینوں نمازِ مغرب پڑھنے کے لیے مسجد آئے۔ نماز کے بعد جب ہم دونوں نے جامی صاحب کو تلاش کیا تو وہ ہمیں مسجد میں نہ ملے۔ میں حیران ہوا کہ انہوں نے ایسا کیوں کیا کہ ہمیں مسجد میں چھوڑ کر غائب ہو گئے تو اعوان صاحب نے بتایا کہ وہ ان دنوں غربت اور مفلسی سے برسرِ پیکار ہیں میرے خیال میں وہ اس لیے غائب ہوئے ہیں کہ ہماری تواضع کے لیے ان کی جیب میں کچھ نہیں تھا۔ یہ سُن کر میرا دل بہت اداس ہوا۔

نہ جانے دل کو کیا ہوا رویا کچھ اس طرح
نہ چپ ہوا وہ میرے دلاسوں کے باوجود

سمیع اللہ ”فلائینگ ہارس“:

عالمی ہاکی کی تاریخ سمیع اللہ ایک بہت بڑا نام ہے۔ دورانِ ملازمت جب تبدیل ہو کر میں بہاول پور آیا تو کالج کی ہاکی ٹیم کا انچارج بنا دیا گیا۔ ملتان میں بھی میں ہی ہاکی ٹیم کا انچارج تھا اور جب فیصل آباد کالج آیا تو یہاں پر بھی کالج ہاکی ٹیم کی ذمہ داری مجھے سونپی گئی۔ سمیع اللہ کالج ہاکی ٹیم کا رکن تھا۔ میں نے سمیع اللہ پر خصوصی توجہ دی اس لیے کہ اس وقت بھی وہ صلاحیتوں کے اعتبار سے انتہائی غیر معمولی انسان تھا۔ چار سال مسلسل میں نے اس کی کوچنگ کی اور وہ پاکستان کی ہاکی ٹیم کے سلیکشن کیمپ کے لیے مدعو کیا گیا۔ میں وہاں بھی اس کے ساتھ جاتا رہا اور اس کے ذاتی کھیل کی خوبیوں خامیوں سے اُسے روشناس کراتا رہا۔ بالآخر وہ پاکستان کی ہاکی ٹیم کے لیے بھی منتخب ہو گیا۔ کافی دیر پاکستان ہاکی ٹیم کا رکن رہنے کے بعد اسے (اُس کی رفتار اور سٹیمنا کی وجہ سے) ”فلائنگ ہارس“ (اُڑنے والا گھوڑا) کے خطاب سے نوازا گیا۔ سمیع اللہ کے کھیل کی مقبولیت کا اندازہ لگانے کے لیے یہ کافی ہے کہ جب وہ گیند کے ساتھ بھاگتا تو سارا اسٹیڈیم اُسے داد دینے کے لیے کھڑا ہو جاتا تھا۔ وہ اپنے کمال کے عروج پر تھا اور پوری دنیا میں اُس کے کھیل کی ایک دھوم مچی تھی۔ اسی دوران مَیں فیصل آباد آ چکا تھا۔ زرعی یونیورسٹی میں ایک مرتبہ آل پاکستان ہاکی نیشنل چیمپئن شپ شروع ہوئی۔ جس میں شرکت کے لیے سمیع اللہ پاکستان کسٹم کی ٹیم کے ساتھ آیا تو مجھے گراؤنڈ میں ملا۔ مجھے کہنے لگا: ”سر آپ نے میچ دیکھ کر جانا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نہیں ہے۔ مجھے آپ سے ایک بہت ضروری کام ہے، مجھے یقین کی حد تک توقع تھی کی آپ سے ملاقات ضرور ہوگی۔''

میں نے کہا کہ اچھا، ملاقات کے بعد گھر جاؤں گا۔لیکن میں یہ سوچ رہا تھا کہ مجھ سے کون سا ایسا کام آن پڑا ہے جس کے لیے اتنی تاکید ہورہی ہے۔ جب میچ ختم ہوا تو سمیع اللہ مجھے لے کر یونیورسٹی کے عقب میں لے گیا جہاں پر پاکستان کسٹم کی ٹیم رہائش پذیر تھی۔ایک کمرے میں بٹھا کر اس نے اپنے باورچی سے کہا دو کپ گرم چائے کے لے آؤ۔ چائے آگئی تو وہ اٹھا اور اس نے کمرے کو اندر سے بند کردیا، میں گھبرایا کہ اس نے کمرہ کیوں بند کردیا ہے۔اب کمرے میں، مَیں اور سمیع اللہ تھا۔میں پریشان اور وہ مسکرا رہا تھا، کہنے لگا آپ کیوں پریشان ہیں میں نے تو کمرہ اس لیے اندر سے بند کیا ہے کہ ہماری گفتگو میں کسی قسم کی کوئی مداخلت نہ ہو۔میں نے کہا کہ اب بتاؤ بھی کہ تمھیں مجھ سے کیا کام ہے؟ کہنے لگا:

''سر میرا مسئلہ ہے کہ اب مجھے کھیل میں میری خامیوں کے بارے میں کوئی نہیں بتاتا۔جس سے بھی پوچھتا ہوں یہی کہتا ہے کہ اب تمھارے کھیل میں کوئی خامی نہیں ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ میرے کھیل پرفیکٹ ہے۔آخر میں نے سوچا کہ یہ تو صرف پروفیسر خالد شبیر صاحب ہی بتائیں گے۔آج آپ میرا یہ کام کردیں۔آپ کی بڑی مہربانی ہوگی۔''

مجھے اپنے پروفیشن سے اُس کی کمٹمنٹ نے متاثر کیا کہ اتنا بڑا کھلاڑی اپنی خامیاں جاننے اور پھر اُنھیں دور کرنے کے لیے اس قدر سنجیدہ ہے خصوصاً جب وہ اپنے کھیل کے عروج اور مقبولیت کی انتہا پر ہے۔میں نے کہا:

''اب تمھارے کھیل میں کیا کمی ہوگی؟ اب پروفیشنل کھلاڑی بن چکے ہو۔دنیا تمھاری عظمت کے گیت گاتی ہے۔میں اب تمھیں کیا خامیاں بتاؤں؟''

سمیع اللہ جواب میں کہنے لگا:''سر، آپ بھول گئے ہیں لیکن مجھے آپ کی یہ بات یاد ہے جسے میں کبھی نہیں بھول سکتا، آپ نے کہا تھا جب کھلاڑی سمجھے کہ وہ مکمل کھلاڑی بن چکا ہے تو وہ اس کے زوال کا پہلا دن ہوتا ہے اور میں نہیں چاہتا کہ ابھی سے زوال سے ہم کنار ہوجاؤں۔''

اس پر میں نے کہا: تمھارے کھیل میں واقعی ایک دو باتیں ہیں، جنھیں دور کرنے سے تمھارا کھیل بہت بہتر ہو جائے گا۔پہلی خامی تو یہ ہے کہ تم نے بطور ''لیفٹ آؤٹ'' فریق مخالف کے ٹوئنٹی فائیو ایریا (Area 25) میں جا کر ''کراس'' لگانی بالکل چھوڑ دی ہے جو تمھاری بنیادی ذمہ داری تھی۔ کیونکہ ''لیفٹ آؤٹ'' کی یہ کراس شوٹ جب فریق مخالف کے گول کے سامنے سے گزرتی ہے تو مخالف ٹیم کے دل دہل جاتے ہیں اس لیے کہ اس کراس پر آپ کا ''سنٹر فارورڈ'' اور ''ان سائیڈ رائٹ'' آسانی کے ساتھ گول کرنے کی پوزیشن میں ہوتا ہے اور فریق مخالف پر گول ہونے کے خاصے امکانات ہوتے ہیں۔تمھاری دوسری خامی یہ کہ تمھیں بال کو لے کر دوڑنے میں مزا آتا ہے، چنانچہ جو بال تمھیں فریق مخالف کے گول کے سامنے 45 ڈگری کے زاویے پر بھی ملتا ہے تم گول کرنے کی بجائے اُسے کھینچ کر ''آؤٹ لائن''

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تک لے آتے ہو اور وہاں سے ''ڈی سرکل'' میں بیک پاس کر دیتے ہو جس پر عموماً گول ہو جاتا ہے۔ اس وقت تمھارا کھیل ایک ہی محور کے گرد گھومتا ہے اور وہ یہ کہ تم بال کو فریق مخالف کی ''آؤٹ لائن'' تک لے آتے ہو اور پھر ڈی سرکل میں بیک پاس کر دیتے ہو۔ تم چونکہ بال کے ساتھ تیز بھاگنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتے اور جب تم بال کے ساتھ بھاگتے ہو تو تمھیں پذیرائی حاصل ہوتی ہے اس میں تمھیں اتنا ہوش ہی نہیں رہتا کہ تمھاری بنیادی ذمہ داری کراس لگانا ہے۔ تم اس وقت ایک ہی کام کر رہے ہو کہ بال کے ساتھ بھاگ کر فریق مخالف کی آؤٹ لائن سے بیک پاس جس پر کوئی دوسرا کھلاڑی گول کر دیتا ہے اور تم اس پر خوش ہو جاتے ہو۔ اس ایک کام کو بھی بوقت ضرورت کرو، لیکن اس کے ساتھ ساتھ کراس بھی لگاؤ اور تیسری بات یہ ہے کہ ڈی کے اوپر جب تمھیں بال مل جائے تو خود سے گول کے لیے بھی کوشش کرو یا تو تمھارا گول ہو جائے گا یا پھر گول کیپر کے ''ری باؤنڈ'' پر تمھارا دوسرا کھلاڑی گول کر سکتا ہے۔

یہ جو تم صرف ایک کام کر رہے ہو اس کا کوئی نہ کوئی توڑ مخالف ٹیمیں، خاص طور پر یورپ والے نکال لیں گے۔ تو پھر تم کیا کرو گے؟ تین کام کرو، ایک جو تم کر رہے، دوسرا کراس لگاؤ اور موقع ملے تو خود گول کرنے کے لیے ٹرائی کرو۔ میں نے جب یہ کہا تو سمیع اللہ اپنی کرسی سے اٹھا اور اس نے مجھے نہ صرف گلے لگا لیا بلکہ خوشی میں پورا اوپر اٹھا کر گھومنے لگا، کہنے لگا: ''خامیاں نکلیں کہ نہیں۔ لوگ کہتے تھے میرے کھیل میں خامیاں نہیں، اب میں آپ کی ان باتوں پر عمل کر کے دکھاؤں گا۔''

یہ ساری کہانی میں نے اس لیے لکھی کہ عموماً یہی ہوتا ہے کہ فن کار کو اگر مقبولیت حاصل ہو جائے تو وہ سمجھ لیتا ہے کہ میں کمال کو حاصل کر چکا ہوں اور اس کے بعد فنی عروج کے بے تحاشا امکانات اس کی نظروں سے اوجھل رہتے ہیں۔

سمیع اللہ کی دوسری متاثر کن بات جو مجھے اب یاد آ رہی ہے، جب سمیع اللہ ریٹائر ہوا تو میں نے روزنامہ جنگ میں ایک مضمون لکھا کہ اس کی ریٹائرمنٹ غلط ہے۔ اگرچہ سمیع اللہ اپنے معیار سے کم ضرور ہوا ہے لیکن ابھی اس سے بہتر کھلاڑی باہر نہیں ہے جس کے لیے اس نے جگہ چھوڑی ہے۔ بعد میں اس سے ملاقات ہوئی تو کہنے لگا: ''سر! یہ بات نہیں کہ باہر کوئی مجھ سے بہتر بیٹھا ہے یا نہیں۔ جب میں اپنے معیار سے نیچے آ گیا ہوں تو مجھے ہاکی چھوڑ دینی چاہیے اور یہ حقیقت تسلیم کر لینی چاہیے کہ میرا کھیل جو پہلے تھا میں اب وہ پیش نہیں کر سکتا۔ سمیع اللہ کا جو کھیل لوگ دیکھنا چاہتے ہیں اگر میں وہ پیش نہیں کر سکتا تو پھر مجھے کھیلنے کا کیا حق ہے؟''

اگر ہمارے سیاست دان چاہیں تو اس کہانی سے بہت کچھ حاصل کر سکتے ہیں جو محض کرسی سے چمٹ کر ہی رہ جاتے ہیں اور کبھی نہیں سوچتے کہ جس کام کے لیے لوگوں نے ہمیں پارلیمنٹ میں بھیجا ہے اگر ہم وہ کام نہیں کرتے تو پھر ہمیں پارلیمنٹ میں بیٹھنے کا کیا حق حاصل ہے۔ ایس۔ ای کالج کے جشن صد سالہ پر میں بھی بہاول پور مدعو تھا، مجھے کالج ہاکی ٹیم اور سمیع اللہ کا کوچ ہونے پر ایک خصوصی ٹرافی دی گئی جسے میں ایک اعزاز سمجھتا ہوں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بہاول پور سے ٹرانسفر:

چار برس ایس ای کالج میں گزارنے کے بعد اچانک وہاں سے سرگودھا تبدیلی کے احکام آ گئے۔ دوستوں نے پریشانی اور دکھ کا اظہار کیا۔ بڑا اصرار ہوا کہ تم انکار کر دو ہم تمھاری ٹرانسفر رکوا لیں گے۔ دوستوں کا وفد پرنسپل صاحب سے ملا۔ اُنھوں نے بھی مجھے بلا کر کہا کہ اگر تم انکار کر دو تو میں تمھاری ٹرانسفر رکوا سکتا ہوں۔ میں نے کہا: ''سر مجھے واپس جانے دیں مجھے عید، بقر عید پر گھر جانے میں خاصی دقت ہوتی ہے۔ میرا بھی جی یہاں پر لگا ہوا ہے، دل نہیں چاہتا کہ یہاں سے جاؤں مگر میرے بوڑھے والدین اور میرے بہن بھائیوں کا بھی مجھ پر حق ہے کہ میں اُن کے درمیان زندگی گزاروں اور دکھ سکھ میں اُن کے پاس رہوں۔ جہاں تک بہاول پور کا تعلق ہے یہاں جو مجھے محبت ملی ہے وہ میرے دل میں ہمیشہ رہے گی، میں اپنے دوستوں کو ملنے کے لیے یہاں آتا رہوں گا کہ میں نہ انھیں چھوڑ سکتا ہوں اور نہ بھول سکتا ہوں۔

چنانچہ وہ دن بھی آ گیا کہ دوست مجھے ریلوے سٹیشن پر الوداع کہنے کے لیے جمع تھے جن کی آنکھوں میں آنسو تھے اور ان کے آنسوؤں کے جواب میں میری آنکھیں بھی بھیگ گئیں تھیں۔ میں نے گورنمنٹ کالج سرگودھا جوائن کیا۔ یہاں پر میں نے مکان لے کر سامان بھی رکھ دیا لیکن ساتھی پروفیسر حضرات نے کہا ابھی سامان کھولیے گا نہیں۔ یہاں سے سیاسیات کے پروفیسر گورنمنٹ کالج فیصل آباد تبدیل ہو گئے تھے وہ واپس شاید یہیں آئیں اور آپ کو فیصل آباد جانا پڑے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور میں نے گورنمنٹ کالج فیصل آباد، فروری ۱۹۷۳ء کی کسی تاریخ کو جوائن کر لیا۔

آخر میں عطاء اللہ اعوان کی کتاب ''ندیمان جمال'' سے ایک اقتباس پیشِ خدمت ہے جو انھوں نے میرے بارے میں تحریر کیا۔ اس کتاب میں انھوں نے امیرِ شریعت، قاضی احسان احمد، مولانا محمد علی جالندھری رحمہم اللہ اور چند دوسرے دوستوں کے بارے میں اپنے تاثرات سپردِ قلم کیے ہیں۔ لکھتے ہیں:

''۱۹۷۰ء کی بات ہے میں گورنمنٹ صادق ایجرٹن (ایس۔ای) کالج کے سٹاف روم میں بیٹھا تھا کہ ایک نیا چہرہ سٹاف روم میں داخل ہوا۔ درمیانہ سے قدرے چھوٹا قد، سرخ و سفید رنگت، آنکھوں میں ذہانت کی چمک، جسم پر سوٹ سج رہا تھا۔ تعارف پر معلوم ہوا پروفیسر خالد شبیر ہیں، شعبہ سیاسیات سے تعلق ہے اور ملتان سے تبدیل ہو کر یہاں تشریف لائے ہیں۔ ایک دو ہفتے تو تکلفانہ انداز میں گزر گئے آہستہ آہستہ کھلنے اور ایسے کھلے کہ جانِ محفل بن گئے۔

یاروں کے یار، دشمنوں کے دشمن، کھرے اور سچے انسان۔ مجلسی آدمی، چائے، سگریٹ اور پان کے عادی، بہترین مقرر اور ادیب، ہاکی کے اچھے کھلاڑی۔ کالج کی ہاکی ٹیم کے انچارج مقرر ہوئے اور پاکستان کے مشہور کھلاڑی سمیع اللہ خان (فلائنگ ہارس) کے کوچ بنے۔ بذلہ سنج اور لطیفہ بازی میں طاق اب شاعری بھی فرما رہے ہیں۔

خالد شبیر اُن دنوں بہاول پور چوک کے قریب ایک کرائے کے مکان میں رہتے تھے۔ دو لڑکوں اور ایک لڑکی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے باپ، جو کماتے خوراک اور لباس پر خرچ کر دیتے۔ اپنے کفن کے لیے بھی نہ رکھتے۔ شام ہوتے ہی خالد شبیر کے دل میں سیر کی تمنا اور دوستوں سے ملنے کی آرزو مچلنے لگتی۔ وہ گھر سے نکلتے سیدھے دوستوں کے ہاں پہنچتے۔ گھنٹہ دو گھنٹہ دوستوں کے درمیان رہتے، چائے کا دور چلتا، حالاتِ حاضرہ پر تبصرہ ہوتا۔ طیب قریشی، فروغ جلیل، احسان الحق، مامون عباس، عبدالرؤف، راقم اور دوسرے احباب مجلس میں شریک ہوتے۔ کالج میں بھی خالی اوقات میں خالد شبیر دولھا بنتا اور ہم سب براتی۔ اس کے لطیفے اور زندگی کے واقعات دوستوں کو گھیرے رہتے۔ خالد شبیر سید عطاء اللہ شاہ کے پروردہ، اُن کی گود میں کھیلے ہوئے۔ شاہ جی پر کتاب کے مصنف جناب نذیر مجیدی کے بیٹے، امیر شریعت کے بیٹوں سید ابوذر بخاری اور محسن بخاری، مومن بخاری کے قریبی ساتھی ہیں۔ احرار کے ان لیڈروں کی طرح حق گوئی اور بے باکی خالد شبیر کا شعار ہے۔ وہ پرنسپل صاحبان کو بھی کھری کھری سنا دیتے۔ ایک پرنسپل کو تو یہ تک کہہ دیا تھا کہ کام نہ کرنا دیوثیت ہے۔ جب تک خالد شیر کالج میں رہے طلباء اور اساتذہ کی آنکھوں کا تارا بنے رہے۔ P.L.A (پنجاب لیکچررز ایسوسی ایشن) کے صدر رہے۔ دوران اجلاس نظم وضبط کی سختی سے پابندی کرائی۔

خالد شبیر احمد چنیوٹ میں عاشق امیر شریعت جناب نذیر مجیدی کے گھر پیدا ہوئے۔ گورنمنٹ کالج فیصل آباد سے گریجویشن کیا اور پنجاب یونیورسٹی سے ایم۔اے سیاسیات کا۔ وہ بہاول پور میں مسافر تھے اور اپنی مادرِ علمی کو واپس جانا چاہتے تھے، لہٰذا اُن کا تبادلہ چار سال بعد فیصل آباد ہو گیا اور اس طرح وہ ہم سے جدا ہو گئے مگر ہم دوستوں کی محفلوں کو ویران کر گئے اور ہمارے درمیان اپنی یادوں کی خوشبو چھوڑ گئے۔ آج تک ویسی محفلیں برپا نہیں سکیں۔ فیصل آباد میں انھوں نے ایک بڑا علمی و ادبی کارنامہ سرانجام دیا اور وہ ہے ''تاریخ محاسبۂ قادیانیت'' جس میں انھوں نے مرزائیت کا تعاقب کرنے کی کہانی درج کی ہے۔ اس کتاب پر سرگودھا بورڈ نے اُنہیں دس ہزار روپے کے انعام سے نوازا ہے۔ وہ حضرت امیر شریعتؒ کے شیدائی ہیں، ہر سال اُن کی یاد میں منعقدہ پروگرام میں شرکت کے لیے ملتان آتے ہیں اور خطاب کرتے ہیں کبھی بہاول پور بھی آ جاتے ہیں۔ دوستوں کو پھر سے جمع کرتے ہیں۔ پرانی یادوں کے چراغ روشن کرتے ہیں۔ سب سے رواداری، سب سے حسنِ سلوک اور سب سے محبت اُن کا شیوہ ہے۔

ہماری دعا ہے کہ وہ اسی زندہ دلی کے ساتھ دوستوں میں زندہ رہیں اور محفلوں کو اپنی ذہانت وظرافت سے زعفران زار بناتے رہیں۔ ''ایں دعا از من واز جملہ جہاں آمین باد

جاری ہے

◆◆◆

© rasailojaraid.com